Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

عنایت الرحمٰن
پی ایچ-ڈی اسکالر اُردو الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

''ضیاء الملک ملاّ رموزی: گلابی اُردو کے موجد از پروفیسر بشیر احمد سوز کا تحقیقی جائزہ''

Inayat ur Rehman
Ph.D. Scholar, Urdu AlHamd Islamic University, Islamabad

A Critical Review of "Zia ul Mulk Mulla Ramuzi: The Founder of Gulabi Urdu" by Prof Bashir Ahmed Soz

Mullah Ramuzi is known in Urdu literature as the inventor of Gulabi Urdu. Gulabi Urdu in its own words means to change the order of the words in the sentence. For example, first the verb then the subject and the object, in this way, the style of translation from Arabic to Urdu is created. Of course it is fun, but after a while the reader gets tired. The atrocities of the government, social injustice and social ills force him to write whatever he writes under the guise of humor.

مُلّا رموزی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے اپنی مختصر سی زندگی میں اپنے فکر و تدبر اور قلم کی جولانیوں سے برصغیر میں معتبر اور محترم ظرافت نگار کے طور پر خود کو منوایا ہے۔ ملاّ رموزی کی زندگی میں ہی مولانا ظفر علی (1) جیسی علمی و ادبی شخصیت ان کی مداح تھی۔ وقت کی دھول نے نجانے ہندو پاک کے نقادوں کی آنکھوں میں کیسی پٹی باندھ دی کہ انہیں ملاّ رموزی کو پہچاننے میں اب تک مشکل پیش آ رہی ہے۔ پاکستان میں ملاّ رموزی کی ادبی خدمات اور ظرافت نگاری کو منظر عام پر لانے کی اگر کسی نے سعی کی ہے تو وہ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ ہیں۔ ''ضیاء الملک ملاّ رموزی'' آپ کی ایک ایسی تصنیف ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ''ضیاء الملک ملاّ رموزی'' ایوارڈ یافتہ (2) تصنیف ہے۔ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ اس کتاب کی تصنیف کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

Corresponding Author's Email: inayatmalik@gmail.com

"کچھ عرصہ پہلے نامور شاعر اور محقق فارغ بخاری کی مرتب کردہ ادبی تاریخ "ادبیات سرحد" کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ملا رموزی کے بارے میں ایک تعارفی نوٹ نظر سے گزرا۔ اس مختصر سے مضمون کے مطالعے کے بعد پہلی بار مجھ پر منکشف ہوا کہ ملا رموزی کے اب وجد افغانستان سے آکر مانسہرہ (ہزارہ ڈویژن) میں آباد ہوئے تھے۔ اور پھر ان کے والد یہاں سے ریاست بھوپال سدھارے۔ فارغ بخاری نے ملا رموزی اور ان کے آباء کا ہزارہ سے رشتہ ناطہ ظاہر کر کے مجھے عجیب اضطراب میں ڈال دیا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ ملا رموزی کے احوال و آثار اور ان کے فن کے بارے میں نہ صرف زیادہ سے زیادہ جان سکوں بلکہ اس نابغہ روزگار شخصیت سے متعلق ایک مقالہ یا کتاب مرتب کر سکوں"۔(3)

ضیاء الملک حافظ محمد صدیق رشادؔ افغانی النسل تھے۔ ان کے آباء افغانستان سے ہجرت کر کے ہزارہ پہنچے اور ایک عرصہ تک یہاں قیام کرنے کے بعد ان کے والد ہندوستان کی ریاست بھوپال چلے گئے۔ ہزارہ سے ان کے گہرے ربط و تعلق کے پیش نظر پروفیسر بشیر احمد سوزؔ نے برصغیر کے اس نامور مزاح نگار، صحافی، شاعر اور ادیب کی زندگی اور کارناموں کے حوالے سے تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر "ضیاء الملک ملاّ رموزی، گلابی اردو کے موجد" تحریر کر دی۔

اس کتاب کی اشاعت ہزارہ چیئر ہزارہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام جولائی 2012ء میں ہوئی۔ ہزارہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) سید سخاوت شاہ اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات لکھتے ہیں:

"ملا رموزی کے حوالے سے لکھی گئی اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ مُلا رموزی گلابی اردو کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ گویا وہ ایسے صاحبِ اسلوب انشاء پرداز تھے جن کا اتباع کوئی نہ کر سکا۔"(4)

مولوی لیاقت حسین ملا رموزی کی کتاب "خطوطِ رموزی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "حد ہے کہ آج اُن کی کتابوں اور مضامین سے بچے، نوجوان اور بوڑھے یکساں فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ یہ وہ ملکہ خصوصی ہے جو صرف فطرت ہی سے کسی کو عطا ہوتا ہے"۔(5)

ملا رموزی کا سب سے بڑا مشغلہ اور شوق تحقیقی اور تخلیقی عمل ہے اور یہی وہ شوق ہے جس کی بناء پر وہ کم و بیش پینتیس کتب کے مصنف ہوئے۔ اور اسی شوق نے انہیں ہندوستان کے مزاحیہ ادب میں ممتاز اور منفرد مقام دلایا۔ ملا رموزی کا بیشتر وقت بھوپال میں ہی گزرا۔ چھوٹے چھوٹے سفر تو ان کی زندگی میں لاتعداد ہیں، مگر بھوپال سے باہر ان کے چند ہی اسفار ہیں۔ جن کے بارے میں انہوں نے مختصراً اپنے مضامین میں لکھا ہے لیکن ان کو ہم سفر نامے کے زمرے میں نہیں لا سکتے۔ ملا رموزی نے انجمن ترقی اردو کے مشن کو آگے بڑھانے اور اردو کی ترویج کی غرض سے بھی ہندوستان کے کئی

علاقوں کے سفر کئے۔ ملار موزی نے اردو کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے جابجا جلسے کئے اور انجمنیں بنائیں۔ پروفیسر بشیر احمد سوز ملار موزی کی معاشی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”ملار موزی کے والد کے سر پر ایک بڑے کنبے کی کفالت کی ذمہ داریاں تھیں جن سے عہدہ برآ ہونا ان کے والد کی استطاعت سے باہر تھا۔ چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد ملار موزی کو اپنے والد کے ساتھ نقل نویسی کے کام میں مدد کرنا پڑی اور حسن اتفاق سے جب وہ مدرسہ الہیات کانپور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آئے تو ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے انہیں ایک بار پھر والد کے ساتھ نقل نویسی کا کام کرنا پڑا“۔(6)

گلابی اردو کی بات کی جائے تو بظاہر یہ نام بہت ہی ہلکا پھلکا، دلنشیں، سماعتوں اور نظروں میں ٹھنڈک کا احساس بھرتا دکھائی دیتا ہے، لیکن جب اس کے اصطلاحی معنوں پر غور کیا جائے تو گلابی اردو کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ انگریز دور میں انگریز سامراج کے خلاف جذبات کا اظہار بہت مشکل کام تھا۔ کیونکہ جو بھی ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا تھا اس کو عبرت کا نشان بنا دیا جاتا تھا۔ لہٰذا انگریز سامراج سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے ایسے پیمانوں کی ضرورت آن پڑی تھی کہ جن سے قوم کی رہنمائی بھی ہو اور انگریز کے ظلم سے بھی بچاؤ ممکن ہو سکے۔ اس مشکل مرحلے میں قومی رہنمائوں، علمائے دین اور اکابرین قوم نے اپنے طور پر خوب محنت اور کوشش کی۔ اس وقت کے اہل قلم نے بھی اپنے قلم و قرطاس کے ذریعے اپنا پیغام قوم تک پہنچایا۔ اس مقصد کے لئے دوسرے اہل قلم کی طرح مولانا ظفر علی خان نے بھی اپنی تحریروں کے لئے نئے اسالیب اختیار کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ ذہانت اور ظرافت کے پیکر ملا رموزی اپنی فکری توانائیوں اور قومی دردمندی کے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے ایسے ہی کسی انداز کے متلاشی تھے جو طنز و مزاح کی آمیزش سے نقد و نظر کا کام بھی لے سکے اور قومی رہنمائی کا فریضہ بھی بطریق احسن انجام دے سکے۔ ملار موزی مولانا ظفر علی خان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے مگر کسی طور بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ مولانا کا اسلوبِ بیان اختیار کر کے اپنی بات کہہ دیں۔ اس وجہ سے ملار موزی نے اپنے لئے وہ راستہ اختیار کیا جو قدامت میں جدت کے پھول کھلانے کا سبب بنا۔ جو جدید بھی تھا اور عجیب و غریب بھی تھا۔ ایسا انداز نہ پہلے کبھی کسی نے اختیار کیا تھا اور نہ بعد میں کوئی اس کا اتباع کر سکا۔ ملار موزی کا جو انداز تھا اس انداز کے وہی موجد تھے اور انہی پر اس اندازِ تحریر کا اختتام بھی ہوا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ خطوطِ غالب کی طرح ملار موزی کا اسلوب بھی بہ ہزار کاوش کے کوئی اختیار نہ کر سکا۔ ملا

رموزی نے اپنے اس اندزِ تحریر اور اسلوب بیان کی شہرت اور مقبولیت کے پیش نظر اپنی کتاب "زندگی" کے دیباچے میں لکھا:

"اچھے اچھے مر گئے، مگر نہ سمجھے کہ یہ کیا ہے"۔(7)

اگر ہم غیر جانبدارانہ فکر کے حامل ہیں تو ہمیں یہ کہنا اور ماننا پڑے گا کہ ملا رموزی نے اردو نثر کو ایک نئی صنف عطا کی ہے۔ لاہور سے شائع ہونے والے ادبی مجلہ "ادبی دنیا" نے اس کا اعتراف اس طرح سے کیا ہے:

ملا رموزی کی گلابی اردو کے لئے اخبار "زمیندار" کا لوگ اس بے چینی سے انتظار کرتے تھے، جس بے چینی سے لوگ جنگ کی خبروں کا انتظار کرتے ہیں۔(8)

ملا رموزی اپنی تحریروں کو جنت کی بہاروں سے تعبیر کرتے تھے۔ اپنی شاعری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"شاعری میں نے عورت ذاتوں کی حمایت اور حفاظت میں شروع کی ہے۔ یعنی اُردو کی شاعری نے عورت کے خلاف جو گندہ، غلط اور خلاف فطرت ذخیرہ جمع کیا ہے میں نے اُس کا جواب اپنی شاعری میں دیا ہے"۔(9)

ملا رموزی نے شعر گوئی کا آغاز 1932ء میں کیا۔ ان کی پہلی غزل کے اشعار پیش ہیں:

میری طرف بھی جو گردش میں جام آیا ہے — سکوں پہ اب کہیں دل کا نظام آیا ہے

تمام عمر تری یاد میں رموزی کو — یہ فخر ہے کہ ترا اک سلام آیا ہے(10)

ملا رموزی مغربی تہذیب کے اثرات سے مسلم نوجوانوں کو عیش پرستی کا شکار ہوتے ہوئی دیکھتے ہیں تو انہیں دکھ ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اس شان سے جیسے کہ ہوں غلمانوں کے بچے
اسکولوں کو جاتے ہیں مسلمانوں کے بچے
پریوں کو جو شرمائیں وہ انسانوں کے بچے
چہرے ہیں یوں سنوارے ہوئے جیسے کہ ہو گلشن
دیکھو تو ذرا آج مسلمانوں کا فیشن(11)

ملا رموزی کا صحافت کے ساتھ بھی گہرا تعلق تھا۔ ملا رموزی بصارت اور بصیرت کے حسن امتزاج کا نام ہے۔ ملا رموزی جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے اسے من و عن پیش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ملا رموزی کے حرف سچے

اور لفظ کھرے ہوتے تھے۔ ملا رموزی جو لکھتے دل سے لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بات پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی تھی۔ ملا رموزی اپنے اسی اسلوبِ بیان کی وجہ سے ادب اور صحافت کے میدان میں ہمیشہ کامیاب و کامران رہے۔ ''ضیاء الملک ملاّ رموزی'' میں پروفیسر بشیر احمد سوزؔ لکھتے ہیں:

> ''ملا رموزی بڑے ادیب تھے یا بڑے صحافی یہ ایک مشکل سوال بھی ہے اور انتہائی آسان بھی۔ ملا رموزی کے اول و آخر کا غائر جائزہ لینے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ملا رموزی فطرتاً ادیب اور عملاً صحافی تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اخبارات و جرائد سے وابسطہ رہا۔ اس وجہ سے ملا رموزی کا صحافت سے رشتہ بہت مضبوط اور توانا تھا''۔(12)

یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ کی ''ضیائ الملک ملاّ رموزی'' ادبیات ہزارہ کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب میں بھی ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب یقیناً اعلیٰ سطح کے طلباء اور سکالرز کے لئے نہایت مفید اور معلومات افزاء ہو گی اور پاکستان میں ادب اور خاص طور پر مزاحیہ ادب کے قارئین کے لئے پروفیسر بشیر احمد سوزؔ کی طرف سے ''ضیاءالملک ملاّ رموزی'' ایک بہترین تحفہ ہے

حوالہ جات

1۔ نظیر حسین زیدی،ڈاکٹر،مولانا ظفر علی خان،احوال و آثار، مجلس ترقی ادب،لاہور،1986ء

2۔ابا سین آرٹس کونسل نے2014میں جسٹس کیانی ایوارڈ سے نوازا۔

3۔ بشیر احمد سوزؔ ،پروفیسر،ضیا ء الملک ملا رموزی:گلابی اُردو کے موجد،"زیدی " لیزر پرنٹرز،فیصل آباد ،جولائی2012،ص:9

4۔ ایضاً،ص:47

5۔ملا رموزی،"خطوط رموزی"،عتیق الرحمان،تاجران کتب،بھوپال،س ن،ص:14

6۔بشیر احمد سوزؔ،پروفیسر،ضیاءالملک ملا رموزی:گلابی اُردو کے موجد،ص:52

7۔ملا رموزی،"زندگی"،عتیق الرحمان،ت،س ن،ص:11

8۔"ادبی دنیا" لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ جگن ناتھ، آزاد، میراجی، شہنشاہ حسین رضوی، مظفر احمد وغیرہ بھی اِس رسالے کے لکھاریوں میں شامل تھے۔ یہ رسالہ مولانا تاجور نے جاری کیا تھا۔اس رسالے کو مولانا صلاح الدین احمد نے ایک ادبی تحریک کی حیثیت دی۔اس رسالے کے مدیران میں ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل رہے۔

مزید دیکھیے:انور سدید،ڈاکٹر،اُردو ادب کی مختصر تاریخ،مقتدرہ قومی زبان،1991ء،ص:408

9۔عبداللہ قریشی،ادبی دنیا،مجلہ،لاہور،1970ء،ص:57

10۔ملا رموزی،"خطوط رموزی"،عتیق الرحمان،ص:128

11۔شاہ جہاں غنی،تمثیل،سہ ماہی،،بھوپال،اکتوبر تا دسمبر2007ء،ص:91

12۔بشیر احمد سوزؔ،پروفیسر،ضیاءالملک ملا رموزی:گلابی اُردو کے موجد،ص:165